بسم اللہ الرحمن الرحیم

دینی نصابِ تعلیم اور تحریک رجوع الی القرآن

شاعرِ مشرق نے اپنی شہرہ آفاق نظم ’’ابلیس کی مجلس شوریٰ‘‘ میں ابلیس کی زبانی اس کے مشیروں سے خطاب میں عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ایک نوع کا اندیشہ ظاہر کیا ہے‘ اور وہ یہ کہ یہ تقاضے شریعتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی حقیقتِ اصلی کے ظاہر و باہر ہونے کا ذریعہ نہ بن جائیں۔ بادیٔ النظر میں یہ صورتحال عصرِ حاضر کے تقاضوں کی بعض ایجابی منفعتوں کا اثبات ہے‘ لیکن دینی نصابِ تعلیم کے ضمن میں اس کے اثرات کا تخمینہ قدرے مختلف ہے۔ دینی تعلیم کا مروّجہ نصاب ’الموسوم بہ درسِ نظامی‘ متداول مسالک کے مراکزِ دینیہ میں معمولی فرق کے ساتھ یکساں طور پر رائج ہے۔ بیشتر مراکز اپنے اپنے وفاق کے ساتھ ملحق ہیں‘ جبکہ بعض ادارے ذاتی حیثیت میں مسلم ہیں اور الحاقی ضرورتوں سے مستغنی۔ مفصل نصاب کے ساتھ ساتھ عصری دباؤ نے مختصر دورانیے کے نصاب بھی متعارف کروائے ہیں‘ جنھیں بنیادی دینی تعلیم کا ذریعہ تو قرار دیا جاسکتا ہے‘ ان کا علومِ دینیہ تک رسائی یا دسترس کی توقعات پر پورا اترنا بعید از قیاس ہے۔

درسِ نظامی کے نصاب میں کیا اور کیسے بہتری لائی جاسکتی ہے...... اس پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور آئندہ بھی لکھا جاتا رہے گا۔ تاہم ناقدین اور مجوزین کے لیے اس تعلیمی نصاب کے مقاصد سے آگہی ضروری ہے جو گہرے فکر و تجربے اور سوجھ بوجھ سے ہی حاصل ہوسکتی ہے۔

حال ہی میں بعض تحریریں نظر سے گزری ہیں جن میں پیش کردہ تجزیے مخلصانہ قرار دیے جانے کے باوجود نہ صرف یک رخے ہیں بلکہ شدید سطحیت کا بھی شکار ہیں۔ ان تجزیوں میں اُمت کی موجودہ زبوں حالی کا واحد سبب درسِ نظامی کے نصاب کو قرار دیا گیا ہے اور اس پستی کا علاج یہ تجویز کیا گیا ہے کہ اس نصاب کو مکمل طور پر تج کر قرآن حکیم پر توجہات کو مرتکز کیا جائے۔

ہماری دانست میں ان تجزیوں میں پیچ در پیچ مغالطے شامل ہیں۔ اصلاحی تجاویز اپنی جگہ‘ خود درسِ نظامی سے وابستہ متعدد غلط فہمیاں ہیں جن کا ازالہ ضروری ہے۔ سب سے نمایاں غلط فہمی اس درسی نصاب کی قرآن حکیم سے لاتعلقی اور بے اعتنائی کا الزامی دعویٰ ہے۔ اس ضمن میں چند اصولی باتیں توجہ میں رکھنا مفید ہوں گی۔

بلاشبہ قرآن حکیم وہ کتابِ ہدایت ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی حضرت محمد ﷺ پر نازل فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کی حکمت اسی بات کی مقتضی ہوئی کہ بجائے ہر ہر شخص کو براہِ راست وحی بھیجنے کے‘ ایک رسولِ بشر کی

جانب وحی نازل فرمائی اور رسول کو اس بات کا ذمہ دار بنایا کہ وحی کی تلاوت، تعلیم اور اس کی لازوال حکمتوں کا بیان ہو۔ چناں چہ بحوائے الفاظِ قرآنی:

﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿١٦٤﴾﴾ (آل عمران)

اس آیہ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اللہ ﷺ کی بعثت کا مقصد بیان کیا گیا ہے۔ بعثتِ رسول میں ہی یہ حکمت پنہاں ہے کہ قرآن مجید کے علوم کا کما حقہٗ ابلاغ رسول کے بغیر مفید نہیں ہوگا۔ حالانکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اہل زبان تھے، عربی میں نازل ہونے والے قرآن کو سمجھ سکتے تھے، لیکن پھر بھی فرمایا اور تاکیداً فرمایا کہ رسول تمہیں کتاب وحکمت سکھاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ قرآن مجید کی وہ تشریح اور تعبیر معتبر ہے جو رسول اللہ ﷺ سکھائیں، اور رسول کے بتائے بغیر کتاب اللہ کی اصل منشاء کو سمجھنا لوگوں کی اہلیت وصلاحیت کے اعتبار سے ممکن نہیں ہے۔ اسی لیے آپ ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو اپنے اقوال وافعال اور روز وشب کے معمولات کے ذریعے کتاب اللہ کی تعلیم دی۔ یہی تعلیمات سنّت وحدیث کہلاتی ہیں۔ قرآنی اصطلاحات سے واقفیت، محاورات کی وضاحت، مسائل فقہ کی تفصیل اور مجملات کی توضیح سنت وحدیث کے بغیر ممکن نہیں۔ اسی لیے علومِ دینیہ میں علمِ حدیث نمایاں مقام رکھتا ہے، لیکن یہ اہمیت اصلاً شارعِ حقیقی کی منشاء کے حصول کی غرض سے ہی ہوتی ہے، اس سے جدا نہیں ہے۔

بعض لوگوں کو یہ مغالطہ ہوجاتا ہے کہ احادیث کا معاملہ نازک اور پُرخطر ہے کہ ان میں ضعیف روایات بھی ہیں اور موضوع بھی۔ اس بارے میں یہی کہنا کافی ہے کہ صرف اس بنا پر علم حدیث سے استغناء برتنا اور قرآن مجید کو محض عقل ومنطق سے سمجھنے کی کوشش کے نتائج کیسے ہوں گے؟ تاریخی طور پر یہ بات مسلم ہے کہ ایسی تمام کوششیں گمراہی اور خروج عن الملۃ کا ذریعہ بنی ہیں۔ چنانچہ امت میں سب سے پہلے جس گمراہ فرقے کی بنیاد پڑی وہ خوارج کا فرقہ ہے، جو یہ سمجھتے تھے کہ ہم ہی قرآن کے اصل داعی اور علمبردار ہیں۔ اس طبقے نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو گمراہ کہا اور اپنے سوا سب کی تکفیر کردی۔ دورِ حاضر میں بھی بعض لوگ ''اہلِ قرآن'' ہونے کے مدعی ہیں اور وہ گمراہ ہوئے، یہاں تک کہ ختمِ نبوت اور حدیث وسنت کے انکار کرنے والے بن گئے۔ یہ تقاضا کرنا اور دعویٰ کرنا کافی نہیں ہے کہ قرآن کو اہمیت دو، بلکہ یہ دعویٰ اور یہ تقاضا تب نتیجہ خیز ہوسکتا ہے جب قرآن کی اہمیت کو اس نہج پر قبول کیا جائے جس کا حکم ہے۔ سنن ابی داؤد کی روایت ہے جس میں اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا: ''تم لوگ مجھ سے سنتے ہو (دین سیکھتے ہو)، لوگ تم سے سنیں گے، اور پھر ان سے سنا جائے گا جو تم سے سنتے ہیں''۔ یہ تعلیم کا فطری طریقہ ہے، اس میں سند اور استاد کی اہمیت ہے۔ بغیر سند اور استاد کے دین سیکھنا خطرات سے خالی نہیں اور یہ طریقہ رسول اللہ ﷺ کے بتائے ہوئے طریقے کے خلاف بھی ہے۔ چنانچہ تابعین میں سے قرآن و سنت کے ایک بہت بڑے عالم عبداللہ بن مبارکؒ فرماتے ہیں: **الاسناد من الدّین ، ولو لا الاسناد لقال من شاء ما شاء** یعنی سند دین کا حصہ ہے، اور اگر سند نہ ہوتی تو جو شخص بھی جو چاہتا کہہ دیتا۔ گھر بیٹھے کتابوں اور

انٹرنیٹ کی مدد سے حاصل کیے گئے علم کا کوئی اعتبار نہیں۔ حصولِ علم کے صحیح ذریعے کا نام سند ہے اور یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قرآن مجید کے سیکھنے اور سکھانے کو افضل ترین عمل قرار دیا اور علماء کو اپنا وارث قرار دے کر ان کے مقام و مرتبہ کی تعظیم و تشریف فرمائی۔

موجودہ درسِ نظامی کے نصاب سے لاعلمی کا ایک واضح ثبوت یہ اشکال ہے کہ ''درس نظامی میں دورۂ حدیث تو پڑھا پڑھایا جاتا ہے' دورۂ قرآن نہیں پڑھایا جاتا''۔ یہ اشکال اس پر دلیل ہے کہ نصاب میں قرآن کا content کم ہے اور یہ امر بالآخر فروغِ مسلکیت کا باعث ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ نصاب میں درجہ ثانیہ سے لے کر درجہ سابعہ تک طلبہ کی استعداد کی مناسبت سے ہر سال قرآن حکیم نصاب میں شامل ہے۔ درجہ ثانیہ میں آخری پارہ تجوید و تفسیر کے ساتھ' ثالثہ میں آخری دس پارے' رابعہ میں درمیانی دس پارے' خامسہ میں پہلے دس پارے' سادسہ میں تفسیر جلالین (مکمل) اور سابعہ میں تفسیر بیضاوی کا کچھ حصہ شامل ہے۔ اس پر مستزاد ہے بعد تکمیل دورۂ تفسیر جو ہر بڑے دار العلوم کا اپنا اپنا اختصاص ہے۔ اس تفصیل کے بیان سے ہمارا مقصد اس مغالطے کی اصلاح ہے جو قرآن حکیم کو اس نصابِ تعلیم سے خالی قرار دینے سے پیدا ہوتا ہے۔ نصاب میں شامل دیگر علوم و فنون: صَرف' نحو' ادب' بلاغت' اصولِ فقہ' اصولِ تفسیر وغیرہ صرف معیارِ فضیلت ہی نہیں سمجھے جاتے بلکہ علومِ قرآن و حدیث کے بنیادی ذرائع و وسائل بھی ہیں۔

ایک مغالطہ یہ بھی پھیلایا گیا ہے کہ موجودہ نصابِ درس نظامی دورِ سلجوقی کے نظام الملک طوسی کے قائم کردہ مدرسہ نظامیہ سے ماٴخوذ ہے۔ یہ مغالطہ التباسِ لفظی کا نتیجہ ہے' جو بارہویں صدی ہجری کے ملا نظام الدین سہالوی لکھنوی کے نام سے پیدا ہوا۔ اس لیے کہ درسِ نظامی کی نسبت ملا نظام الدین سہالوی لکھنوی کی جانب تو کسی حد تک مسلّم ہے' البتہ نظام الملک طوسی کی طرف ثابت شدہ نہیں۔ ذیل میں ایک تحقیق پیش ہے جو ہندوستان کے ایک سکالر محمد اللہ خلیلی قاسمی نے ''ہندوستان میں مسلمانوں کا نصابِ تعلیم'' کے عنوان سے نہایت عرق ریزی سے تالیف کی ہے۔ نصابِ تعلیم کی اسلامی تاریخ کو sum-up کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> ''اسلام نے روزِ اوّل ہی سے علم کی اہمیت پر زور دیا اور مسلمانوں کو تعلیم جیسی دولت بے بہا کو حاصل کرنے کی تاکید کی۔ ابتدائے عہدِ اسلام میں جبریل امین علیہ السلام کے واسطہ نازل ہونے والا الٰہی فرمان اور دربارِ نبوت سے صادر ہونے والے الفاظ و اعمال یعنی قرآن و حدیث ہی مسلمانوں کے نظامِ تعلیم کا نصاب تھا۔ قرآن کی موقعہ بہ موقعہ نازل ہونے والی آیات کو لکھنے' پڑھنے اور یاد کرنے کا خاص التزام کیا جاتا تھا۔ حدیث کے مذاکرہ کا رواج تھا' کچھ صحابہ حدیث کو لکھنے کا بھی اہتمام کرتے تھے۔
>
> نبی اکرم ﷺ کے بعد صدیقی دورِ خلافت میں قرآن کریم کی تدوین کی طرف توجہ ہوئی اور اسے ایک مصحف میں نہایت اہتمام و احتیاط کے ساتھ جمع کیا گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں اسلامی مملکت کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا اور اسلام عرب سے نکل کر بلادِ عجم تک پہنچ گیا اور نت نئی تبدیلیاں واقع ہونے لگیں۔ چناں چہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جملہ شعبہ ہائے حیات اور خصوصاً شعبۂ تعلیم میں زبردست انقلابی

تبدیلیاں کیں اور ترقیات کی بنیاد ڈالی۔

پہلی صدی ہجری میں احادیثِ مبارکہ کی تدوین کا سلسلہ شروع ہوگیا اور اس کے بعد کی دو صدیاں تدوین و ایجادات کی صدیاں ثابت ہوئیں۔ خلافت اسلامیہ کے بعد اموی وعباسی ادوار میں اسلام دنیا کے متمدن علاقوں تک پہنچ چکا تھا۔ دین اسلام کے بڑھتے دائرہ اور نت نئے مسائل و واقعات کے پیش نظر حرفتوں‘ علوم اور فنون کی تدوین و ایجاد شروع ہوئی۔ قرآن وحدیث کے معانی ومطالب کو سمجھنے کے لیے عجمیوں کو نحو وصرف جیسے علوم کی ضرورت ہوئی اور یہ علوم ایجاد ہوئے‘ ادباء وعلمائے نحو پیدا ہوئے۔ ترقیات کی کثرت اور عالمِ اسلام کی وسعت کے لحاظ سے نئے مسائل وحالات پیدا ہوتے رہے اور علماء و فقہاء کی ایک بڑی تعداد قرآن و حدیث کی روشنی میں ان مسائل و حالات کے حل نکالنے میں مشغول ہوئی۔ اس طرح فقہ و اصولِ فقہ کی تدوین عمل میں آئی اور تفسیر و اصولِ تفسیر‘ حدیث و اصولِ حدیث‘ فقہ و اصولِ فقہ‘ صرف ونحو‘ اسماء الرجال اور تواریخ ومعاجم کے متعلق علوم کی کتابیں لکھی جانے لگیں۔

اُس وقت تک مساجد اور درسی حلقات کے بنیادی نصاب میں یہی قرآن وحدیث اور اس سے متعلق علوم نصاب کا جزو رہے۔ پانچویں صدی میں امام غزالی نے یونانی فلسفہ کے زیر اثر پیدا ہونے والے اسلام مخالف اَفکار ونظریات کے رد میں علم کلام کو اختیار کیا جس سے اسلامی فلسفہ اور منطق کا رواج ہوا۔ یہ علوم اُس وقت اور اس کے بعد کے تقریباً تمام ہی عالم اسلام کے خطوں میں مشترک تھے‘ لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا مختلف اسباب و وجوہات کی بنیاد پر مختلف علاقے مختلف علوم کے ساتھ مشہور ہوتے گئے۔ جیسے عرب کے علاقے میں تفسیر‘ حدیث‘ اصولِ حدیث اور اَسماء الرجال جیسے علوم سے زیادہ شغف رہا۔ اسلامی اندلس میں تاریخ‘ ادب اور شاعری زیادہ مرغوب رہی‘ جب کہ ایران کے لوگ منطق وفلسفہ سے دلچسپی میں ہمیشہ ممتاز رہے۔ اسی طرح خراسان وماوراء النہر (وسط ایشیا) میں بعد کی صدیوں میں فقہ‘ اصول فقہ اور تصوف کا خوب رواج رہا۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد اموی خلافت کے دور میں پہلی صدی ہجری کے اندر ہو چکی تھی اور محمد بن قاسم کے ہاتھوں سندھ وملتان فتح ہو چکے تھے۔ اسی طرح پانچویں صدی ہجری میں سلطان محمود غزنوی نے سندھ و پنجاب کو زیرنگیں کرلیا تھا اور اپنی فتوحات کا دائرہ گجرات تک وسیع کرلیا تھا‘ لیکن ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کی ابتدا دراصل چھٹی صدی ہجری (مطابق ۱۲۰۶ء) کے اخیر میں سلطان شہاب الدین غوری کے نائب قطب الدین ایبک کے دور سے ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب وسط ایشیا کے مسلمان تفسیر وحدیث کے ساتھ صرف ونحو‘ بلاغت وادب اور کلام وتصوف کو بھی اہمیت دینے لگے تھے۔ چونکہ وسطِ ایشیا اور دیگر اسلامی ملکوں میں تاتاری حملوں کے بعد مضبوط اسلامی حکومت ہندوستان میں ہی قائم ہوئی تھی اور یہ علاقہ تاتاری یورشوں سے تقریباً آزاد تھا‘ اس لیے ان علاقوں کے علماء و مشائخ اور عام مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد ہندوستان آ گئی تھی۔ چنانچہ فطری طور پر ان کے ساتھ یہ ذوق ہندوستان منتقل ہوا اور یہیں سے ہندوستانی نظام تعلیم کی بنیاد پڑی۔

مولانا حکیم سید عبدالحیؒ لکھنوی نے اپنے ایک مقالے ’ہندوستان کا قدیم نصاب درس اور اس کے

تغیرات' میں قدیم ہندوستانی نصاب تعلیم کو چار ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ ذیل میں اسی بنیاد پر اختصار کے ساتھ عہدِ وسطیٰ میں ہندوستانی مسلمانوں کے نصابِ تعلیم کا ایک خاکہ پیش کیا جا رہا ہے:

پہلا دور: اس کا آغاز ساتویں ہجری سے سمجھنا چاہیے اور انجام دسویں صدی پر اس وقت ہوا جب کہ دوسرا دور شروع ہو گیا تھا۔ کم و بیش دو سو برس تک اِن فنون کی تحصیل معیارِ فضیلت سمجھی جاتی تھی: صرف' نحو' ادب' بلاغت' فقہ' اصول فقہ' منطق' کلام' تصوف' تفسیر' حدیث۔ اس طبقے کے علماء کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں علمِ فقہ معیارِ فضیلت تھا' حدیث میں صرف 'مشارق الانوار' کا پڑھ لینا کافی سمجھا جاتا تھا اور حدیث میں مزید درک و مہارت کے لیے 'مصابیح' آخری کتاب تھی۔ اس زمانے کے نصاب تعلیم میں جو خصوصیات نظر آتی ہیں وہ فاتحین ہند کے مؤثر اور نکھرے ہوئے مذاق کا نتیجہ تھیں۔ ہندوستان میں اسلامی حکومت کی بساط جن لوگوں نے بچھائی' وہ غزنی اور غور سے آئے تھے۔ یہ وہ مقامات تھے جہاں فقہ اور اصول فقہ کا ماہر ہونا علم و فن کا طرۂ امتیاز سمجھا جاتا تھا اور ان ممالک میں فقہی روایات کا پایہ بہت بلند تھا۔

دوسرا دور: نویں صدی ہجری کے آخر میں شیخ عبداللہ اور شیخ عزیز اللہ ملتان سے دہلی سلطان سکندر لودھی کے دربار میں آئے اور انھوں نے سابقہ معیارِ فضیلت کو کسی قدر بلند کرنے کے لیے قاضی عضدالدین کی تصانیف 'مطالع' و 'مواقف' اور علامہ سکاکی کی 'مفتاح العلوم' نصاب میں داخل کیں۔ اس دور میں میر سید شریف کے تلامذہ نے 'شرح مطالع' اور 'شرح مواقف' اور علامہ تفتازانی کے شاگردوں نے 'مطول مختصر المعانی' اور 'تلویح و شرح عقائد نسفی' کو رواج دیا۔ نیز اس زمانہ میں 'شرح وقایہ' اور 'شرح جامی' داخل نصاب کی گئیں۔ اس دور کے آخر میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے علمائے حرمین شریفین سے علم حدیث کی تکمیل کر کے علم حدیث کو فروغ دینے کی کوشش کی۔ ان کے بعد ان کے فرزند شیخ نور الحق نے بھی درس حدیث کی اشاعت کی کوشش کی۔ اس طبقے کے علمائے کرام کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں 'مفتاح العلوم' سکاکی اور قاضی عضدالدین کی 'مطالع' اور 'مواقف' منتہیانہ کتابیں تھیں۔

تیسرا دور: دسویں صدی کے اخیر میں میر فتح اللہ شیراز (ایران) سے ہندوستان آئے' اکبر نے ان کو عضد الملک کا خطاب دے کر پذیرائی کی۔ انہوں نے سابق نصاب درس میں کچھ معقولی کتابوں کے اضافے کیے اور انہی کے زیر اثر ہندوستانی نصاب میں ان کا رواج ہوا۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ جو اس دور کے سب سے آخری مگر سب سے زیادہ نامور عالم تھے' حرمین شریفین تشریف لے گئے اور وہاں چودہ ماہ قیام فرما کر علم حدیث کی تکمیل کی اور ہندوستان آ کر اس سرگرمی سے اس کی اشاعت کی کہ جس کے اثرات آج تک باقی ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ اور ان کے اَخلاف نے صحاحِ ستہ کے درس و تدریس کو اپنی سعی و کوشش سے جزوِ نصاب بنا دیا۔ شاہ صاحب نے ایک نیا نصابِ درس بھی مرتب کیا تھا' مگر چونکہ اس زمانے میں علم کا مرکز دہلی سے لکھنو منتقل ہو چکا تھا' نیز ہمایوں اور اکبر کے زمانے میں ایران سے جو نیا تعلق ہوا تھا' اس نے بتدریج ہندوستان کے علمی مذاق میں ایک جدید تغیر پیدا کر دیا تھا۔ مغل دربار کے ایرانی امراء اور علماء کے ذریعے منطق اور فلسفہ کو آہستہ آہستہ دوسرے علوم پر فوقیت حاصل ہوتی گئی' اس لیے شاہ صاحب کے نصاب کو قبولِ عام حاصل نہ ہو سکا۔

چوتھا دور: چوتھا دور بارہویں صدی ہجری سے شروع ہوا‘ اس کے بانی ملا نظام الدین سہالوی لکھنویؒ تھے جن کا مرکز فرنگی محل لکھنؤ تھا۔ درس نظامی کے نام سے جو نصاب آج تمام مدارسِ عربیہ میں رائج ہے وہ ان ہی کی یادگار ہے۔ ملا نظام الدین نے دورِ سوم کے نصاب میں اضافہ کر کے ایک نیا نصاب مرتب کیا اور اس دور میں پڑھائی جانے والی کتابوں کو حتی الامکان جمع کرنے کی کوشش کی۔ درسِ نظامی میں تیرہ موضوعات کی تقریباً چالیس کتابیں پڑھائی جاتی تھیں۔ فقہ اور اصول فقہ کے ساتھ‘ تفسیر میں ’جلالین‘ و ’بیضاوی‘ اور حدیث میں ’مشکاۃ المصابیح‘ داخل تھی۔ انھوں نے ریاضی اور فلکیات کی کئی کتابیں اور ہندسہ (انجینئرنگ) پر بھی ایک کتاب شامل نصاب کی۔ اس میں طب‘ تصوف اور ادب کی کوئی کتاب شامل نہیں تھی اور منطق و فلسفہ کو خاصی جگہ دی گئی۔

تیرہویں صدی کے وسط میں ہندوستان میں علم کے تین مرکز قائم تھے: دہلی‘ لکھنؤ اور خیر آباد۔ گو نصابِ تعلیم تینوں کا قدرے مشترک تھا‘ تاہم تینوں کے نقطہ ہائے نظر مختلف تھے۔ دہلی میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کا خاندان کتاب و سنت کی نشر و اشاعت اور تعلیم و تدریس میں ہمہ تن مشغول تھا‘ یہاں تفسیر و حدیث پر زیادہ توجہ دی جاتی تھی‘ علومِ معقولہ کی حیثیت ثانوی درجے کی تھی۔ لکھنؤ میں علمائے فرنگی محلّی پر ماوراء النہر کا ساتویں صدی والا قدیم رنگ چھایا ہوا تھا‘ فقہ اور اصول فقہ کو ان کے یہاں سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی‘ تفسیر میں ’جلالین‘ و ’بیضاوی‘ اور حدیث میں صرف ’مشکاۃ المصابیح‘ کافی سمجھی جاتی تھی۔ خیر آبادی مرکز کا علمی موضوع صرف منطق و فلسفہ تھا اور یہ علوم اس قدر اہتمام سے پڑھائے جاتے تھے کہ جملہ علوم کی تعلیم ان کے سامنے ماند پڑ گئی تھی۔

۱۸۵۷ء کے تاریخی حادثۂ انقلاب میں تقریباً ملک سے ساری نامور درس گاہیں برباد کر دی گئیں اور خصوصاً ملک کا شمالی حصہ جو اس تحریک کا مرکز تھا اور دینی علوم و فنون کا گہوارہ تھا‘ اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی۔ اس واقعہ کے تقریباً دس سال بعد جب دیوبند میں دار العلوم کی بنیاد پڑی‘ اس کے نصاب میں ماضی قریب کے تینوں علمی گہواروں‘ دہلی‘ لکھنؤ اور خیر آباد‘ کی خصوصیات کو جمع کیا گیا۔ اس طرح اس میں درس نظامی کو بنیاد بناتے ہوئے ’صحاحِ ستہ‘ کو شامل کیا گیا۔ دار العلوم دیوبند کا یہی نصابِ تعلیم تقریباً ڈیڑھ صدیوں سے ہندوستان کے اکثر مدارس میں مروّج ہے۔ دیوبند نے ان علوم کی عظمت کو نہ صرف یہ کہ باقی رکھا بلکہ ترقی دینے میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔ اس نصاب کی خصوصیت یہ ہے کہ طالب علم میں امعانِ نظر اور قوتِ مطالعہ پیدا کرنے کا لحاظ اس میں زیادہ رکھا گیا ہے۔ اگرچہ اس نصاب کی تحصیل کے معاً بعد کسی مخصوص فن میں کمال حاصل نہیں ہوتا‘ مگر یہ صلاحیت ضرور پیدا ہو جاتی ہے کہ طالب علم محض اپنے مطالعہ اور محنت سے جس فن میں چاہے کمال پیدا کر لے۔

اس وقت دار العلوم دیوبند اور اس کے طرز پر چلنے والے مدارس میں فضیلت تک تقریباً تیس موضوعات کی پچاس سے زیادہ کتابیں پڑھائی جاتی ہیں۔ ان موضوعات میں تفسیر و ترجمۂ قرآن‘ حدیث و اصولِ حدیث‘ فقہ و اصولِ فقہ‘ نحو و صرف‘ معانی و بیان و بلاغت‘ منطق و فلسفہ‘ تاریخ و تصوف‘ عقائد و ادب اور تجوید وغیرہ جیسے علوم پڑھائے جاتے ہیں۔ ابتدا کی چند کتابوں کو چھوڑ کر ساری کتابیں عربی زبان میں

ہیں۔ دورۂ حدیث کے بعد طالب علم کے ذوق وشوق اور اس کی صلاحیت کے مطابق اسے تفسیر واصولِ تفسیر، حدیث واصولِ حدیث، فقہ وفتاویٰ یا ادبِ عربی میں سے کسی ایک فن میں تخصّص کی سہولت مہیا کی جاتی ہے اور اس سلسلے میں اس کی رہنمائی کی جاتی ہے۔ کمپیوٹر، انگریزی وغیرہ کے بھی کورسز ہیں جو ان موضوعات سے دلچسپی رکھنے والے طلبہ کو اس میدان میں آگے بڑھنے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔

دارالعلوم دیوبند کے نصاب کو 'درسِ نظامی' کا نام دیا جاتا ہے، جو کسی حد تک صحیح کہا جا سکتا ہے۔ لیکن کچھ لوگوں کو اس نام سے یہ غلط فہمی ہوتی ہے کہ یہ نصاب بعینہٖ بارہویں صدی ہجری کا ہے، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ دارالعلوم کے اس نصاب کی بنیاد وہی درس نظامی تھا جو قیام دارالعلوم کے وقت عموماً ہندوستانی مدارس ودرس گاہوں میں رائج تھا، لیکن دارالعلوم کے قیام کی ابتدا ہی سے 'درسِ نظامی' جوں کا توں کبھی بھی نصاب نہیں رہا اور بعد میں حالات کے تقاضے کے پیش نظر اس میں تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ اگر کوئی شخص مُلّا نظام الدین کے درس نظامی کا آج کے دارالعلوم دیوبند کے نصاب سے موازنہ کرے تو اسے دارالعلوم کے نصاب کو درس نظامی کا نام دینے میں بھی ہچکچاہٹ ہوگی، کیوں کہ اس میں علوم عالیہ کے ساتھ علوم آلیہ کی کتابوں میں بنیادی تبدیلیاں کی گئی ہیں، درسِ نظامی کی متعدد کتابوں کو بالکل نکال کر دوسری کتابوں کا اضافہ کیا گیا ہے، جب کہ بہت سے موضوعات کی کتابوں کو بدل دیا گیا ہے۔ نصابِ دارالعلوم میں زمانہ کے تقاضوں کے مطابق تغیر وتبدل اور حذف واضافہ کا عمل مسلسل جاری ہے۔ علوم دینیہ کے ساتھ عصری علوم اور معاشی ضرورتوں کا بھی لحاظ رکھا جا رہا ہے۔ دارالعلوم میں دارالصنائع، شعبۂ کمپیوٹر، شعبۂ انگریزی وشعبۂ صحافت اسی مسلسل عمل کا ایک حصہ ہیں۔

نصاب کی تبدیلی کے سلسلے میں ایک بات ضرور یاد رکھنی چاہیے کہ دارالعلوم دیوبند اور اس جیسے مدارس کا مقصد دینی علوم وثقافت کی حفاظت اور اسلام کی نشر واشاعت ہے، لہٰذا ایسی کوئی تبدیلی جو اس عظیم مقصد میں خلل انداز ہو، اسے قطعاً قبول نہیں کیا جا سکتا ہے۔ علومِ عالیہ یعنی قرآن، حدیث اور فقہ کو صحیح طور پر سمجھنے اور ان میں درک حاصل کرنے کے لیے جن علوم کی ضرورت ہوتی ہے، ان علوم کی تعلیم ہی ان مدارس کا اصل مقصد ہے۔ اس میں دوسرے علوم وفنون کی گنجائش محض اسی حد تک ہے جب تک کہ یہ دوسرے علوم ان مدارس کے اصل مقصد میں حائل یا مخل نہ ہوں۔'' (ماہنامہ دارالعلوم (انڈیا)، شمارہ:۵، جلد:۹۴، جمادی الاول۔ جمادی الثانی ۱۴۳۱ ہجری مطابق مئی ۲۰۱۰ء)

متذکرہ بالا بحث اور تاریخی منظر نامہ پیش کرنے سے یہ بات الم نشرح ہو کر سامنے آ جاتی ہے کہ مسلمانوں کا دینی تراثِ علمی اللہ تعالیٰ کی مشیتِ کاملہ اور حکمتِ بالغہ کا مظہرِ کامل ہے۔ دین ہم تک پندرہ سو سال بعد بھی اپنی اصل حالت میں پہنچا ہے، یہ امر خود اس بات پر دلیل ہے کہ دینی نصابِ تعلیم کی ترتیب وتالیف میں وارثانِ نبوت ورسالت نے تعمیری ومخلصانہ کردار ادا کیا ہے، اور یہ سلسلہ ان شاء اللہ قیامت تک جاری رہنے والا ہے۔ مرکزی انجمن خدام القرآن کے بانی ومؤسس ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کو قرآنی دعوت کے فروغ اور حکم واقامتِ دین کی جدوجہد کے ضمن میں علمی وتعلیمی ضرورتوں کا شدت سے احساس تھا۔ چناں چہ ۶۸۔۱۹۶۷ء میں انہوں ماہنامہ ''میثاق'' کے ادارتی صفحات میں اپنے وقیع تجزیے پیش کیے اور آخر میں اُس مضمون پر اس سلسلے کا اختتام ہوا جو

بعد میں ’’اسلام کی نشأۃ ثانیہ: کرنے کا اصل کام‘‘ کے عنوان سے شائع ہوا‘ جس میں احیائے اسلام کے لیے صحیح اور مثبت لائحۂ عمل کی نشان دہی کی گئی اور اسی کے ذیل میں ایک ’’قرآن اکیڈمی‘‘ کے قیام کی تجویز پیش کی گئی۔

مجوزہ قرآن اکیڈمی کے قیام کے مقاصد کی وضاحت میں ایک جگہ ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ رقم طراز ہیں:

’’......ایسے نوجوانوں کی تعلیم و تربیت اس اکیڈمی کا اصل کام ہوگا۔ اور اس کے لیے ضروری ہوگا کہ ان کو پختہ بنیادوں پر عربی کی تعلیم دی جائے‘ یہاں تک کہ ان میں زبان کا گہرا فہم اور اس کے ادب کا ستھرا ذوق پیدا ہو جائے۔ پھر انہیں پورا قرآن حکیم سبقاً سبقاً پڑھایا جائے اور ساتھ ہی حدیث نبوی ﷺ فقہ اور اصولِ فقہ کی تعلیم دی جائے۔ پھر ان میں سے جو لوگ فلسفہ و الٰہیات کا ذوق رکھنے والے ہوں گے ان کے لیے ممکن ہوگا کہ وہ قرآن حکیم کی روشنی میں جدید فلسفیانہ رجحانات پر مدلّل تنقید کریں اور جدید علم کلام کی بنیاد رکھیں۔ اور جو عمرانیات کے مختلف شعبوں کا ذوق رکھنے والے ہوں گے ان کے لیے ممکن ہوگا کہ وہ زندگی کے مختلف شعبوں کے لیے اسلام کی رہنمائی و ہدایت کو اعلیٰ علمی سطح پر پیش کر سکیں۔‘‘ (اسلام کی نشأۃ ثانیہ: کرنے کا اصل کام‘ صفحہ ۲۶)

قرآن اکیڈمی کے پہلے مرحلے میں ’دار المقامہ‘ کی تعمیر کی گئی جہاں کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اُن طلبہ کو رہائش کی پیشکش کی گئی جو اپنے اوقات میں سے دو گھنٹے دینی تعلیم کے پروگراموں میں شرکت کرنے کے لیے تیار ہوں۔ بیان کردہ انہی مقاصد کے حصول کے لیے ’’معہد ثانوی‘‘ کے عنوان سے ایک تعلیمی منصوبہ شروع کیا گیا۔ یہ منصوبہ بوجوہ چل نہ سکا اور دو سال بعد بند کرنا پڑا۔ اس تجربے کے بعد ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ نے ایک نئی اسکیم کا آغاز کیا جو اعلیٰ تعلیم سے فارغ ہونے والے باصلاحیت نوجوانوں کی تعلیم و تربیت اور قرآن اکیڈمی کے مقاصد کے حصول کے لیے ایک غیر معمولی اسکیم تھی۔ اسے ’’قرآن اکیڈمی فیلوشپ اسکیم‘‘ کا نام دیا گیا۔

اس اسکیم سے وابستہ نوجوانوں کو علومِ دینیہ کی تدریس کے لیے ماہر اہل علم کی خدمات حاصل کی گئیں۔ عربی زبان و ادب‘ فقہ‘ اصولِ فقہ‘ اصولِ تفسیر‘ ترجمہ و تفسیر اور دیگر علومِ دینی کی تدریس کے لیے پنجاب یونیورسٹی کے پروفیسر حافظ احمد یارؒ صاحب‘ شیخ الحدیث مولانا الطاف الرحمٰن بنوی صاحب‘ پروفیسر علامہ غلام شبیر بخاریؒ صاحب‘ پروفیسر مولانا عصمت اللہ صاحب اور ان کے علاوہ کئی نامور اصحابِ علم و دانش کی خدمات حاصل کی گئیں۔ یہ سلسلۂ تعلیم اب ’’رجوع الی القرآن‘‘ کے عنوان سے جاری و ساری ہے اور ہر سال تیس تا چالیس افراد اور اتنی ہی تعداد میں خواتین اس دینی نصاب سے مستفیض ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ نے اپنی حیاتِ مستعار کے آخری دور میں دینی نصابِ تعلیم کے ضمن میں ایک نہایت غیر معمولی تجربہ کیا جو بحمد اللہ پچھلے دس سال سے عمدگی کے ساتھ جاری ہے۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ سنہ ۸۸۔۱۹۸۷ء میں قرآن کالج کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا گیا تھا جہاں ایف اے‘ آئی کام اور بی اے کی تعلیم کے ساتھ ایک مختصر دینی نصابِ تعلیم کی تدریس کا سلسلہ شروع کیا گیا تھا۔ کئی سال کے تجربے کے بعد ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ نے محسوس کیا کہ یہ مختصر نصاب علومِ دینیہ میں ویسی استعداد نہیں پیدا کر پا رہا جو مطلوب ہے۔

(باقی صفحہ 37 پر)